ضیاء الامت کی فقہی بصیرت

محمد خالد مسعود

حضرت ضیاء الامت سے ملاقات کا شرف تو حاصل ہے لیکن بہت مختصر۔ چنانچہ ان کے بارے میں میری معلومات کا ذریعہ زیادہ تر وہ تحریریں ہیں جو ان کے عقیدت مندوں کی والہانہ محبت کا اظہار ہیں۔ میری درخواست پر ڈاکٹر منظور صاحب نے مجھے محترم پیر کرم شاہ صاحب کے مقالات اور عدالتی فیصلے فراہم کئے میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔ تاہم اس بات کے لئے معذرت خواہ بھی ہوں کہ اپنی دفتری مصروفیات کی بنا پر ان کا کما حقہ مطالعہ نہیں کر سکا۔ میں اس تحریر میں تحقیق کا حق تو ادا نہیں کر سکوں گا تا ہم حضرت ضیاء الامت کی تحریروں سے چند ایسی مثالیں پیش کرنے کی کوشش ضرور کروں گا جو میری نگاہ میں حضرت کی فقہی بصیرت کی غماز ہیں۔

میں یہاں پروفیسر حافظ احمد بخش صاحب کا خصوصی شکریہ ادا کرنا چاہوں گا ایک تو اس لئے کہ میں نے ان کے تحقیقی مقالے سے بہت استفادہ کیا ہے اور مجھے احساس ہے کہ میں اس تحریر میں ان کے معیار پر پورا نہیں اتر سکوں گا۔ دوسرے اس لئے بھی کہ انہوں نے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ ہم عقیدت اور محبت کے والہانہ اظہار میں اکثر اصل موضوع کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ ہم تحقیق کے خلا کو یا تو مبالغہ آمیز طرز بیان سے پورا کرنے کی کوشش کر تے ہیںیا تکرار محض سے خانہ پری کرتے ہیں۔ اس تگ و دو میں نقصان یہ ہوتا ہے کہ علم اور تحقیق کی پیش رفت نہیں ہو پاتی۔ ممدوح کی علمی خدمات کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ علم و تحقیق کا سلسلہ جاری رہنا چاہئے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ جہاں ہم اپنے بزرگوں کی علمی خدمات کا ذکر کریں وہاں ان پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہوے مستقبل میں ان کی فکر سے نئی راہیں اور نئی روشنی حاصل کر یں۔ ہم اپنی عقیدت میں ان جیتی جاگتی شخصیتوں کو بت بنا ڈالتے ہیں ۔ ان سے فیضان کے سلسلہ جاریہ کو روك دیتے ہیں یا ایسی شکلوں

میں محدود کر دیتے ہیں جو اس شخصیت کی فکری وسعتوں کی بجائے ہماری اپنی مخصوص سوچ کی نمائندگی کرتی ہیں۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ محبت و عقیدت میں حد بندیاں مشکل ہیں لیکن مجھے یہ خطرہ رہتا ہے کہ عقیدت اپنی حد سے گذر کر خود پرستی میں نہ بدل جائے۔

اس جملہ معترضہ بلکہ پیرہ معترضہ کے لئے معذرت خواہ ہوں تاہم میں ضروری سمجھتا ہوں کہ محترم پیر محمد کرم شاہ صاحب کی فقہی بصیرت کا مشاہدہ کھلی آ نکھوں ہی ممکن ہے ، عقیدت کی چکا چوند میں ضیاء الامت کی ضیا پاشیوں سے محرومی کا اندیشہ ہے۔ پیر صاحب کے متوسلین سے معذرت خواہ ہوں کہ آئندہ گفتگو میں پیر صاحب کو ان کے القاب کی بجائے ان کے نام گرامی سے یاد کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ یقین دلاتا ہوں کہ ان کے متوسلین میں نہ ہوتے ہوئے بھی اس جسارت سے میری عقیدت میں کمی نہیں ہو گی۔

پیر کرم شاہ صاحب کی شخصیت کی بہت سی جہتیں ہیں۔ آج کی مجلس میں ان میں سے بہت سے پہلووں کا ذکر ہوا۔ فقہ و قانون کے حوالے سے بھی پیر صاحب بہت جامع شخصیت کے حامل ہیں۔ پیر صاحب قاضی اور جج بھی تھے ، مفتی بھی ، فقیہ اور مجتہد بھی۔ وہ مدرس بھی تھے مربی بھی۔ یوں وہ علم فقہ کے سارے پہلو اپنی ذات میں سمیٹے ہوئے تھے۔ لیکن میرے نز دیک ان کی ذات کا جو پہلو آج بھی رہنمائی کر سکتا ہے وہ ان کی فقہی بصیرت ہے۔ اس لئے کہ وہ محض مقلد فقیہ نہیں بلکہ فقیہ مجتہد ہیں۔ ان کی فقہی بصیرت اجتہاد کی صرف قائل ہی نہیں اور اس کامحض تقاضا ہی نہیں کرتی بلکہ اس کے لئے راہ بھی تیار کرتی ہے۔ ان کی بصیرت میں ایک مفتی کی ژرف نگاہی بھی ہے اورایک قاضی کی زیرکی اور معاملہ فہمی بھی۔

فقیہ محض مدرس ہو تو وہ متون میں محدود رہ کر بھی اپنے فرائض و واجبات ادا کر سکتا ہے لیکن ایک اچھا مدرس ان مختلف فقہی متون میں اصل اصول، اجماع ،اختلاف، ترجیح الراجح اور نوادر سے آگاہی رکھتا ہو تو وہ خود مجتہد نہ ہوتے ہوئے بھی مجتہد پیدا کر سکتا ہے۔ایک مفتی فقہی متون پر گہری نظر رکھتا ہو تو وہ افتا کے فرائض تو سر انجام دے سکتاہے لیکن ایک

اچھے مفتی کے لئے ضروری ہے کہ وہ محض ترجیح الراجح کے اصولوں سے ہی نہیں بلکہ اپنے زمانے اور علاقے کے حالات، عرف، رسوم و رواج اور افراد کی نفسیات کے ساتھ ساتھ عصری علوم سے بھی شناسا ہو۔ایک قاضی متون اور اصول مذاہب سے واقف ہو اور آداب قضا پر عبور رکھتا ہو تو وہ کامیاب قاضی تو ہوسکتا ہے لیکن ایک اچھے قاضی کے لئے ضروری ہے کہ وہ مقاصد شریعت سے بھی آگاہی رکھتا ہو تاکہ وہ یہ نظر رکھ سکے کہ اس کے فیصلے سے شریعت کے تقاضے کس حد تک پورے ہوتے ہیں اور یہ فیصلہ متعلقہ افراد کی زندگی پر بالخصوص اور عام معاشرے کی بہبود پر بالعموم کس طرح اثر انداز ہو گا۔ میرے خیال میں فقہی بصیرت ان تمام خوبیوں کے مجموعے کا نام ہے۔فقیہ قاضی ہو، مفتی ہو یا مدرس، اس بصیرت کا متعلقہ پہلو اس کی ہر حیثیت میں موجود ہوتا ہے تبھی اس صحیح معنوں میں حامل فقہ کہا جاسکتا ہے۔

فقہی بصیرت کی مندرجہ بالا تعریف کی وضاحت کے لئے میں پیر صاحب کی تحریروں سے صرف چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

ضیاء الا مت کے عدالتی فیصلے (لاہور: ضیاء القرآن پبلی کیشنز،۲۰۰۳) میں تصویر کے احکام (صفحات ۱۹۹ تا ۲۱۸) کے عنوان سے پیر صاحب کا ایک فیصلہ موجود ہے جو متون کی چھان پھٹک، دلالت نصوص کے اصولوں، تاریخی تعبیر اور حالات و عرف زمانہ کے اعتبار کی بصیرت افروز مثال ہے۔ تصویر کے بارے میں فقہاء ملت میں اس کی حلت و حرمت کے بارے میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس اختلاف کے اسباب میں نصوص شریعت اور متون فقہ کے معانی کے فہم میں فرق بھی ہے اور تصویر کے استعمال اور عرف کے تعین میں تفاوت بھی۔ مسئلہ زیر بحث شناختی کارڈ پر تصویر کا تھا۔ وفاقی شرعی عدالت میں اپیل کنندہ کا موقف تھا کہ جاندار اشیا کی تصویر بنانا شریعت اسلامیہ کے احکام کے خلاف ہے اس لئے شناختی کارڈ پر تصویر لگانے کی پابندی ختم ہونی چاہئے۔ پیر صاحب نے اپنے فیصلے میں ان تمام دلائل کا تجزیہ پیش کیا جو موقف کے حق میں اور اس کے خلاف پیش کئے گئے تھے اور پھر اپنا فیصلہ تحریر کیا۔

سب سے پہلے تو پیر صاحب نے نصوص کا جائزہ لیا۔ قرآنی آیات کے

جائزے کے بعد آپ اس نتیجے پر پہنچے کہ قرآن کریم کی کسی آیت سے نہ تماثیل و تصاویر کی حرمت ثابت ہوتی ہے اور نہ جواز ثابت ہوتا ہے۔احادیث کے جائزے میں یہ بات سامنے آئی کہ جن احادیث میں تصاویر و تماثیل کے بارے میں حکم بیان ہوا ہے ان کی نوعیت یکساں نہیں۔ بعض احادیث ایسی ہیں جن سے ہر قسم کی تصویر کی حرمت ثابت ہوتی ہے ۔ بعض احادیث ایسی ہیں جن سے مطلقاً کراہت ثابت ہوتی ہے اور بعض صحیح احادیث ایسی بھی ہیں جن سے بعض تصاویر کا مباح ہونا ثابت ہوتا ہے۔ ان تمام احادیث کے تجزیے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ احادیث جن میں مصورین کے لئے اشد العذاب یا خلود فی النار کی وعید سنائی گئی ہے اس سے مراد صرف وہ مصور یا مجسمہ ساز ہیں جو اس نیت سے تصویریں اور مجسمے بناتے ہیں کہ ان کی وہ خود عبادت کریں گے یا دوسرے لوگ ان کی پرستش کریں گے۔ قرآن و سنت کی نصوص کے جائزے کے بعد پیر صاحب ان نصوص کے تاریخی پس منظر کا مطالعہ پیش کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ اب ہمیں غور کرنا چاہئے کہ حضور کریم ﷺ نے بعض احادیث میں تصویر کے بارے میں اتنا شدید موقف کیوں اختیار کیا۔ علامہ قرطبی، امام ابو بکر ابن عربی، علامہ طحطاوی، علامہ ابن عابدین شامی، علامہ ابن قدامہ، علامہ عبد الرحمن الجزیری ، شارحین بخاری اور بہت سے دوسرے محققین کے اقوال کے مطالعے سے پیر صاحب اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تصویر کی حرمت کا سبب اس عہد کا تاریخی پس منظر ہے۔ اسلام سے پہلے بت پرستی کا عام رواج تھا۔ اسلام جو خالص توحید کا علمبردار ہے اس نے نہ صرف لوگوں کو شرک کے ارتکاب سے روکا بلکہ ایسے امور و محرکات کو بھی قطعاً ممنوع قرار دے دیا جو شرک کے محرك بن سکتے ہیں۔ اس لئے ابتدا میں حضور کریم ﷺ نے ہر قسم کی تصویر کے بارے میں حرمت کا حکم صادر فرمایا۔ بعد میں جب مشرکانہ عقائد سے کلیتاً نفرت ہو گئی اور توحید کا عقیدہ ان کے دلوں میں راسخ ہو گیا اس وقت حرمت کے احکام میں تدریجاً تخفیف کر دی گئی۔

اس کے بعد فقہی متون کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے پیر صاحب لکھتے ہیں کہ فقہاء کرام نے اپنے اپنے نقطہ نظر کے مطابق تصاویر کے بارے میں اظہار خیال فرمایا ہے۔ غیر ذی روح کی تصویر خواہ وہ مجسم ہو یا محض نقوش

ہوں اس کی اباحت کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں وہ سب کے نزدیک مباح ہیں۔ البتہ ذی روح اشیا کی تصاویر کے بارے میں فقہاء کے اقوال مختلف ہیں۔ نصوص اور متون کے جائزے کے بعد پیر صاحب مسئلہ زیر بحث کی طرف آتے ہیں: لکھتے ہیں کہ اس تفصیلی بحث کے بعد ہم اب شناختی کارڈ کے موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس پر آشوب دور میں جب کہ عیاری اور مکاری ایک فیشن کی صورت اختیار کر چکی ہے شناختی کارڈ بنوانا ضروریات میں شامل ہے۔ جو لوگ ہر قسم کی تصویر کے عدم جواز کے قائل ہیں وہ بھی اس ضرورت کے پیش نظر اس کو جائز قرار دیتے ہیں۔

پیر صاحب کی فقہی بصیرت کے کم از کم دو پہلو اس فیصلے میں نمایاں ہیں، ایک تو قرآن و سنت کی نصوص میں یہ اصول کہ کسی ایک نص یا اس کے جزء پر انحصار نہ کیا جائے بلکہ تمام آیات اور احادیث کے مجموعی جائزے کے بعد ہی حکم کا صحیح استنباط ممکن ہے۔ دوسرے نصوص کے مفہوم میں تاریخ اور معاشرت کا فہم بھی ضروری ہے۔ ان کی فقہی بصیرت کا دوسرا اہم پہلو فقہ شریعت میں زمان و مکان اور سیاق و سباق کا شعور بھی ہے تا کہ شریعت کے اطلاق میں ایسی راہ نہ اختیار کی جائے جو مقاصد شریعت کے حصول کی بجائے ان کی مخالفت کی طرف لے جائے۔ اپیل کنندہ نے ایک دینی جذبے کے تحت تصویر کی حرمت کے فقہی فتوی کا اطلاق شناختی کارڈ پر کرتے ہوے شناختی کارڈ کے قانون کو خلاف شریعت قرار دینے کی درخواست کی تھی۔ اس دینی جذبے میں شریعت کے نفاذ کی نیک خواہش کا اظہار تو تھا جو یقیناً قابل قدر تھا لیکن یہ ایک ایسے دینی رویے کا اظہار ہے جو قانون اور شریعت کو محض اس لئے واجب التعمیل سمجھتا ہے کہ یہ شریعت کا حکم ہے ، اس کے اسباب اور وجوہ تلاش نہیں کرتا۔

شاہ ولی اللہ اور ان سے پہلے بہت سے مسلم مفکرین نے شریعت کے اس تصور کو نا قابل قبول ٹھہرایا ہے۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ "احکام شریعت کسی بادشاہ کے احکام کی طرح بے مقصد نہیں ہیں جو صرف اپنے غلاموں کا امتحان لیتا ہے کہ وہ اس کی بے چون و چرا اطاعت کرتے ہیں یا نہیں۔ شریعت کے احکام ہر گز بے مقصد نہیں ۔ وہ ایک ایسی ہستی کے احکام ہیں جو

حکیم بھی ہے اور رحیم بھی۔ وہ اپنی اطاعت کا صرف اس لئے حکم نہیں دیتا کہ وہ حاکم ہے بلکہ اس لئے کہ اس کے احکام میں انسانوں کی بھلائی ہے"۔ امام شاطبی نے بہت تفصیل سے وضاحت کی ہے کہ شریعت تمام تر انسانوں کی بھلائی کے لئے ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "احکام شریعت انسانوں کی پانچ بنیادی ضرورتوں کی حفاظت کے لئے نازل ہوے ہیں۔ یہ پانچ بنیادی ضرورتیں ہیں: دین، جان،مال،عقل اور نسل۔ دین کی حفاظت کے لئے عبادات کے احکام، جان کی حفاظت کے لئے قصاص کے احکام، مال کی حفاظت کے لئے احکام معاملات، عقل کی حفاظت کے لئے احکام خمور و شرب اور نسل کی حفاظت کے لئے نکاح و طلاق کے احکام۔ یہ حفاظت مثبت اور منفی دونوں طرح سے فرمائی گئی۔ منفی حفاظت کے لئے جنایات یعنی سزاؤں یا حدود اور قصاص و دیت کے قوانین ہیں اور مثبت حفاظت کے لئے عبادات، معاملات، مناکحات اور عادات کے احکام کو حاجیات اور تحسینیات کے ذریعے استحکام بخشا۔ امام شاطبی کے نزدیک استنباط احکام ، اجتہاد اور نفاذ شریعت میں مقاصد شریعت کا اعتبار لازمی ہے۔

افراد کی نفسیات بدلتی رہتی ہیں۔ معاشرتی رویے تغیر پذیر ہیں۔ اسی لئے فقہاء ہر دور میں اپنے حالات اور ضروریات کے اعتبار سے استنباط احکام کرتے آئے ہیں۔ ان کے فتاوی ذاتی رائے پر مبنی نہیں ہوتے اور نہ ہی وہ اپنے زمانے کے حالات کی رعایت کے بغیر رائے دیتے ہیں۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ان فقہاء کی رائے سے استفادہ کرتے وقت ان حالات کو نظر انداز نہ کریں جن کو پیش نظر رکھتے ہوے انھوں نے وہ رائے قائم کی۔ اس عمل میں مقاصد شریعت کا علم اور اس کے اصول بہتر رہنما ثابت ہوتے ہیں۔ شناختی کارڈ کے مسئلے پر پیر صاحب کا فیصلہ اس کی عمدہ مثال ہے۔

پیر کرم شاہ صاحب کی فقہی بصیرت کی دوسری مثال کے لئے میں آپ کو اس فیصلے کے مطالعے کی دعوت دوں گا جو اسی محولہ بالا کتاب میں دیت (صفحات ۱۴۴ تا ۱۷۷) کے عنوان سے شامل ہے۔ وقت کی کمی کی وجہ سے میں اس فیصلے کی تفصیل میں تو نہیں جاوں گا۔ میں اس فیصلے کے صرف ایک اہم نکتے کی طرف توجہ دلاوں گا۔ اس نکتے کا تعلق قصاص و دیت کی

اہمیت سے ہے۔ یہ بات قابل افسوس ہے کہ پاکستان میں قصاص و دیت کامسئلہ سیاسی مصلحتوں کا شکار رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دوسرے اسلامی قوانین کے نفاذ میں تو بہت مستعدی یا عجلت سے کام لیا گیا لیکن قصاص و دیت کے قانون کو اس لئے معرض التوا میں ڈال دیا گیا کہ اس کے نفاذ سے بعض سیاسی مخالفین کو فائدہ پہنچنے کا احتمال تھا۔

پیر صاحب نے اس فیصلے میں قصاص و دیت کی حکمت بیان کرتے ہوئے اس کے معاشرتی پہلو پر نظر ڈالی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ قصاص کا قرآنی حکم تاریخ قانون انسانی میں ایک انقلابی قانون تھا۔ اس کا صحیح ادراک تبھی ہو سکتا ہے جب ہم عرب زمانہ قبل اسلام کے ان قبائلی قوانین کا مطالعہ کریں اور ان کے پس منظر سمجھنے کی کوشش کریں کہ قرآن کریم نے قصاص کے قانون کو قانون حیات کیوں کہا ہے۔ قرآنی قانون ایک جانب عرب قبائلی قانون ثأر (بدلہ ، انتقام) کی اصلاح پیش کرتا ہے اور دوسری جانب یہودی قانون النفس بالنفس (خون کے بدلے خون) کی۔ پیر صاحب ان تمام نکات کا جائزہ لیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ عرب کے قبائل کو اپنے نسلی تفوق پر بڑا ناز اور غرور تھا۔ اگر کسی ایسے خاندان کے آدمی کو قتل کر دیا جاتا جس کا شمار روساء اور شرفاء میں ہوتا تو اس قبیلہ کے لوگ صرف اپنے مقتول کے قاتل کو قتل کرنے پر اکتفا نہ کرتے بلکہ اجتماعی طور پر قاتل کے خاندان پر ہلہ بول دیتے اور جتنے لوگوں پر ان کا بس چلتا انہیں تہ تیغ کر دیتے۔ قرآن کریم نے اس قبیح رسم کے خاتمے کا اعلان کیا کہ قصاص میں مساوات کا اصول کار فرما ہوگا ۔ اس ضمن میں غلاموں اور عورتوں کو بھی برابر کا درجہ دیا۔ قانون یہود میں خون کا بدلہ خون بہت سختی سے نافذ تھا۔ قرآن کریم نے قانون قصاص کے ذریعے اس میں تخفیف کا اعلان کیا اور خون کے بدلے دیت اور صلح اور معافی کی رعایت دی۔ آج کے دور میں سزائے موت اور کیپیٹل پنشمنٹ کی جو بحثیں علماء قانون کے ہاں جاری ہیں ان کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس بات کا ادراک ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے قانون قصاص کو زندگی کا قانون کیوں قرار دیا۔ اسے اللہ کی جانب سے تخفیف اور رحمت کیوں کہا گیا۔ ہمارے ہاں عموما اسلامی سزاؤں کی اس خصوصیت پر تو

زور دیا جاتا ہے کہ یہ انتقام اور زجر و توبیخ کے لئے ہیں لیکن اس بات کی طرف توجہ نہیں دی جاتی کہ اسلامی سزائیں معاشرے کی بہبود اور سلامتی اور استحکام پر بھی نظر رکھتی ہیں اور فرد کی فلاح و بہبود کا بھی۔

میں اس ضمن میں ایک اور اہم نکتے کی طرف بھی توجہ دلانا چاہتا ہوں جس کی طرف پیر صاحب نے خصوصی توجہ دلائی ہے۔ وہ یہ ہے کہ بعض اوقات قصاص کے قانون سے بعض لوگ غلط فائدہ بھی اٹھا سکتے ہیں۔ صاحب حیثیت لوگ دیت ادا کر کے آسانی سے اپنا پیچھا چھڑا سکتے ہیں۔ اس سے قتل جیسے گھناونے جرائم کو تقویت مل سکتی ہے۔ پیر صاحب نے اس مسئلے پر غور کرتے ہوے فقہاء کی آراء پر بحث کی ہے کہ ایسے حالات میں سلطان، ریاست یا حکومت وقت تعزیری سزا دے سکتی ہے۔ خواہ اولیاء دم نے معاف بھی کر دیا ہو یہ سزا قید بھی ہو سکتی ہے۔ فقہاء نے اس تعزیری سزا کی ضرورت پر ایسے حالات میں زور دیا ہے جب قانون کی بالا دستی کمزور پڑ جائے اور لوگ قتل جیسے گھناونے جرم دلیری سے کرنے لگیں۔

پیر صاحب کے اس فیصلے سے، جو فقہی بصیرت کی بہترین مثال ہے ہم آج کل کے ایک بہت اہم مسئلے میں استفادہ کر سکتے ہیں۔عرب زمانہ جاہلیت کا رواج جس میں باپ بیٹی کو عار یا غیرت کی وجہ سے زندہ دفن کر دیتے تھے ۔ قرآن کریم میں اس رواج کی بہت شدید مذمت کی گئی ہے۔اس رواج کو وأد البنات کے نام سے ذکر کیا جاتا ہے ۔ آج کے دور میں بھی بعض قبائلی رواج چلے آ رہے ہیں جو جاہلی دور کی یادگار ہیں۔ ہمارے ہاں غیرتی قتل جو وأد البنات کے شنیع جرم سے کسی طرح کم نہیں شقی القلب باپ اور بھائی اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو اسی قبائلی رواج کی اطاعت میں غیرت کے نام پر قتل کر دیتے ہیں لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ قصاص کا حوالہ دے کر چھوٹ جاتے ہیں۔

کیا غیرت کے نام پر قتل کی گئی بیٹیوں کو یہ سوال کرنے کا حق نہیں کہ وہ کس جرم کی پاداش میں قتل کی گئیں؟ کیا اس مقتول یا مقتولہ کے رشتہ دار قصاص سے اس لئے بری ہیں کہ وہ غیرت کے نام پر قتل کے مرتکب ہوے ہیں؟ کیا قتل عمد کے اس صریح جرم کے با وجود قاتل باپ شفقت و رحمت

کا مالک رہتا ہے؟ مجھے یقین ہے اس مسئلے کے حل میں پیر صاحب کی فقہی بصیرت سے بہت رہنمائی مل سکتی ہے۔ قتل غیرت کے مقدمات میں کم از کم قاتل کو تعزیری سزا ضرور ملنا چاہئے تا کہ اس قبیح جرم اور غیر اسلامی جاہلی رسم کا قلع قمع ہو سکے۔ و ما توفیقنا الا باللہ العلی العظیم۔

[دار العلوم محمدیہ غوثیہ ، خیابان کرم ، اسلام آباد میں حضور ضیاء الامت بحیثیت منصف، فقیہ،قانون دان، کے عنوان سے منعقد سیمینار میں ۹ جنوری ۲۰۰۵ کو پڑھا گیا]